احمد ندیم قاسمی

پروفیسر حمید احمد خاں

تہذیبی قدروں کی زندہ علامت

پروفیسر حمید احمد خاں کی رحلت سے لاہور شرافت، شفقت، شائستگی اور ایمان داری کے ایک محبوب پیکر سے محروم ہوگیا ہے۔ وہ ایک مانے ہوئے ماہر تعلیم تھے۔ ایک محنتی استاد تھے اور ایک باوقار وائس چانسلر تھے، مگر ان کی ان سب اہم حیثیتوں پر بھی ان کی انسانیت بھاری تھی۔ وہ ان تمام تہذیبی اور مجلسی قدروں کی ایک زندہ علامت تھے جن کی توانائی سے آج کا معاشرہ محروم ہوتا جارہا ہے۔ اتنے با اصول استاد اور ایسے دردمند انسان آج کل نظروں سے ذرا کم ہی گزرتے ہیں۔ اس پر مستزاد ان کی حق گوئی، اور بے باکی تھی جن کی وجہ سے قدم قدم پر انھیں مخالفتوں سے بھی سابقہ پڑا، مگر ان کی راست بازی اس معیار کی تھی جو کوئی ایسا سمجھوتہ نہیں کرسکتی جس سے راستی پر زد پڑتی ہو۔

پروفیسر حمید احمد خاں اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے علم و ادب اور سیاست سے یہ خطۂ ارض صدی پون صدی سے متاثر ہورہا ہے۔ آپ مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور کے چھوٹے بھائی تھے دوسرے دونوں بھائی بھی علم و ادب میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ پروفیسر محمود احمد خاں کے علمی تبحر کا ایک زمانہ قائل ہے اور مولانا حامد علی خاں نے اردو ادب و فن کی جو بے شمار خدمات انجام دی ہیں، ان کے بھی ہم سب معترف ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے علمی، تحقیقی اور ادبی مشاغل ساری عمر جاری رکھے، مگر ان کا بیشتر وقت تعلیم و تعلم ہی میں گذرا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف کی تعداد بہت کم ہے۔ اب آخری عمر میں وہ اپنے منتشر مضامین کو یکجا کررہے تھے اور اپنے محبوب موضوعات۔ غالب و اقبال۔ پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ افسوس کہ ان کی اچانک موت سے یہ کتابیں نامکمل رہ گئیں۔ مگر ان نامکمل مسودات کو بھی شائع ہوجانا چاہیے، کیونکہ ان میں بھی تحقیق و تنقید کے ایسے ایسے جواہر پارے موجود ہوں گے جن سے آئندہ نسلوں کی رہنمائی ہوگی۔ دراصل پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم جس طرح بچے تلے انداز میں بولتے تھے، اسی طرح بچے تلے انداز میں لکھتے تھے۔ ان کے ہر جملے کا باقاعدہ ایک علمی پس منظر ہوتا تھا اور وہ اپنے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتے تھے۔ مرزا غالب کے حالات کے سلسلے میں انھوں نے جس انداز میں داد تحقیق دی اس کے سلسلے میں ان کی لگن اور ریاضت کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ آج کل ان کا محبوب موضوع علامہ اقبال، ان کا فن اور ان کا فلسفہ تھا اور ان کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ علامہ پر انھوں نے جو کتاب شروع کر رکھی تھی، وہ مکمل ہونے پر اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافے کا موجب بنتی۔ چنانچہ ہماری استدعا ہے کہ ان نامکمل مسودات کی اشاعت کا فوراً بندوبست ہونا چاہیے۔

اس طرح ان بے بدل تحریروں کو بھی بقائے دوام حاصل ہوگی اور ہمارے تہذیبی سرمائے میں بھی قابل قدر اضافہ ہوگا۔

مرحوم سے مجھے اتنا ذاتی قرب تو حاصل نہیں تھا کہ میں ان کے معمولات اور ان کے مزاج و کردار کی جزیات کے بارے میں اعتماد سے کچھ کہہ سکوں، مگر مجھ سے وہ ہمیشہ نہایت شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ اس زمانے میں انھیں کچھ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں لاہور کے اہلِ علم کی ایک کمیٹی کے اجلاسوں کی صدارت فرماتے تھے۔ مجھے بھی اس کمیٹی میں شمولیت کی عزت حاصل تھی، چنانچہ ان محفلوں میں جہاں مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، شیخ محمد اکرام، سید وزیر الحسن عابدی اور ڈاکٹر اجمل کے سے اہلِ علم کے مہذب معیارِ بحث سے مستفید ہونے کا موقع ملا، وہیں پروفیسر حمید احمد خاں (کہ اس مجلسِ یادگارِ غالب کے صدر تھے) کی گفتگو سنی اور اندازہ ہوا کہ انگریزی کے اس پروفیسر کو اردو زبان سے اور اردو زبان کے اتنے بڑے شاعر سے کتنی بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ اس مجلسِ یادگارِ غالب نے صد سالہ برسی کی تقریب پر جو کچھ کیا، وہ پنجاب یونیورسٹی کی پوری تاریخ کا ایک قابلِ فخر واقعہ ہے۔ متعلقہ مطبوعات کا معیار اعلیٰ درجے کا ہے اور انھیں اتنی نفاست کے ساتھ مرتب اور طبع کیا گیا ہے کہ ہر کتاب پر پروفیسر حمید احمد خاں کی نفاستِ طبع اور شائستگی کی دل آویز مہر ثبت نظر آتی ہے۔ ابھی یہ کام تکمیل پذیر نہیں ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی حالات کے تحت اور مرحوم کی اصول پسندی کے باعث انھیں یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کو چھوڑنا پڑا۔ مگر ان کے بعد علامہ علاؤالدین صدیقی نے یہ منصب سنبھالا تو پروفیسر حمید احمد خاں کے کام کو جاری رکھنے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ انہی کے دور میں غالب کی متعدد تصانیف اور اس کے متعلق یہ کتابیں چھپ کر تیار ہوئیں۔ ان کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خاں کے یہ الفاظ بہت اہم مضمرات رکھتے ہیں کہ:-

> "یہ کتابیں فروری ۱۹۶۹ء میں شایع ہو رہی ہیں۔ گویا ان کی تاریخ اشاعت سے مرزا غالب کی حیات بعد ممات کی دوسری صدی شروع ہوتی ہے، مجلس کو یقین ہے کہ اس دوسری صدی میں غالب کے قبول عام کی سرحدیں کچھ اور وسیع ہو جائیں گی۔ خدا کرے کہ دنیا کو ہند اسلامی تمدن کے آخری ترجمان سے روشناس کرانے میں مجلس کی یہ سعی رائیگاں نہ جائے۔"

مجھے ایک اور واقعہ کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دن تھے۔ لاہور پر بھارتی ہوائی جہازوں کے حملے شروع ہو چکے تھے اور دن میں دس دس بیس بیس مرتبہ سائرن کی آوازیں گونجتی تھیں۔ ایک پُرجوش نوجوان کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس عالم میں انھوں نے اہلِ قلم کا ایک جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستانیوں کے عزم بالجزم کا دنیا کے سامنے اعلان کیا جائے۔ یہ مقصد نیک تھا۔ اس لیے میں بھی اس جلوس میں شرکت کرنے ناصر باغ پہنچ گیا۔ کچھ دیر میں پروفیسر حمید احمد خاں بھی پروفیسر سید وقار عظیم کی معیت میں تشریف لے آئے۔ پھر ڈاکٹر محمد باقر بھی آ نکلے مگر خاصی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب مزید اہلِ قلم تشریف نہ لا سکے، تو پروفیسر حمید احمد خاں نے تجویز پیش کی کہ یہیں ایک جلسہ کر کے اور ایک قرارداد منظور کر کے جلوس کے پروگرام کو ملتوی کرا دیا جائے۔ کیونکہ چار اہلِ قلم کا جلوس کچھ بھلا نہیں لگتا۔ سبھی نے اس تجویز کی تائید کی مگر جلوس کے منتظم کو شاید عزتِ نفس کا شدید احساس تھا انھوں نے کہا کہ کم سے کم آپ چاروں اس جیپ پر سوار ہو کر فرلانگ دو فرلانگ تک تو چلیں کہ کچھ بھرم رہ جائے۔ ناچار ہم چاروں اس جیپ میں جا کھڑے ہوئے اور جیپ چلا دی گئی۔ آس پاس کے لوگوں نے یہ

منظر دیکھا تو ساتھ ہو لیے اور جی۔ پی او تک اس ہجوم نے باقاعدہ ایک جلوس کی صورت اختیار کرلی۔ اُس روز پروفیسر حمید احمد خاں کا غصہ بھی دیدنی تھا اور بے بسی بھی۔ غصہ اس بات پر تھا کہ اہلِ قلم کیوں نہ پہنچے اور اگر نہ پہنچ سکے تو انھیں شارع قائداعظم پر کیوں تماشا بنایا جا رہا ہے۔ اور بے بسی یہ کہ وہ چلتی جیپ سے چھلانگ نہیں لگا سکتے تھے۔ آخر سب نے طے کیا کہ اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔ جو تقریر کر سکتا ہے وہ تقریر کرے، اور جو نظم سنا سکتا ہے وہ نظم سنائے۔ چنانچہ پروفیسر حمید احمد خاں، سید وقار عظیم اور ڈاکٹر محمد باقر نے تقریریں کیں۔ میں نے نظم پڑھی، ادھر اُدھر ہجوم میں مجھے جو بھی شاعر دکھائی دیا، اُسے بیں جیپ میں کھینچ لایا اور اسے نظم پڑھنا پڑی آخر مسجد شہدا کے چوک میں اس "جلوس" کو منتشر ہونے کی اجازت ملی۔ اور جب ہم لوگ خان صاحب یا وقار صاحب کی کار میں آکر بیٹھے تو خاں صاحب نے دعا مانگی کہ خدا نہ کرے ہمیں آیندہ اس طرح کے واقعے سے سابقہ پڑے۔ وہ تو خیر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مگر اس دوران کا وہ واقعہ ناقابلِ فراموش ہے جب جلوس نکلنے سے پہلے ایک صاحب نے کہا کہ جلوس کے دوران میں اگر ہوائی حملے کا سائرن بج اٹھا تو ہمارا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ اس پر پروفیسر حمید احمد خاں گرجے۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہوگا کہ ہم جیپ میں کھڑے رہیں گے۔ چاہے ہمارے پرخچے ہی اڑ جائیں۔ جیپ سے کود کر کوئی پناہ ڈھونڈنا ان لوگوں کو نہیں سجتا جو اہلِ ملک کو آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا درس دینے نکلے ہیں ——!

ضروری اعلان

"مجلس یادگارِ حمید" نے پروفیسر حمید احمد خاں کے مکاتیب مرتب اور شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مرحوم کے عزیزوں اور دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اس علمی اور ادبی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور اُن کے پاس مرحوم کے لکھے ہوئے جو خطوط ہوں اُنھیں بذریعہ رجسٹری مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرما کر اس کارِ خیر میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں۔

خطوں کے تصویری عکس لے کر اصل خطوط بحفاظت واپس بھیج دیے جائیں گے۔

منتظرِ کرم

سید وقار عظیم

۷-ای- بلاک سی

سمن آباد —— لاہور